بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

آپ کو زندگی میں بارہا ایسی جگہوں پر جانے کا اتفاق ہُوا ہو گا جہاں رنگارنگ کے قمقمے روشن ہوں۔ روشنی کے ان مختلف مظاہر میں اگر ایک بنفشی ہے تو دوسرا سرمئی، ایک ازرقی ہے تو دوسرا اخضری، ایک کا رنگ اگر نارنجی ہے تو دوسرا سرخ نظر آتا ہے۔ ممکن ہے ایک سطح بین آنکھ رنگوں کے اس اختلاف کو اس نُور کے اختلاف پر محمول کرے جس سے یہ سارے قمقمے منور ہیں مگر یہ محض فریب نظر ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ مظاہر میں ہے حقیقت میں ان کے اندر قطعاً کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ سارے ایک ہی نور کے مختلف پرتو ہیں۔

روشنی کے ان رنگین فانوسوں کی طرح ایک تمدن کے مظاہر خواہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف نظر آئیں لیکن ان میں بھی کوئی بنیادی اور اساسی اختلاف نہیں ہوتا کیونکہ یہ بھی سارے ایک ہی بنیادی تصور کے رُخ زیبا کا عکس ہوتے ہیں۔ کسی تمدن کا اصل جوہر اس کے مظاہر حیات نہیں ہوتے بلکہ وہ بنیادی روح ہوتی ہے جو ان میں جاری و ساری رہتی ہے تمدن کا اصل محل انسان کا ذہن ہے اور اسی سے افکار و نظریات کی مختلف شعاعیں پھوٹتی ہیں جو بالآخر اُس کی زندگی کے سارے گوشوں کو روشن کر دیتی ہیں۔ یہ مظاہر کے اعتبار سے خواہ کتنا متنوع نظر آئے مگر روح کے لحاظ سے ایک ہی ہوتا ہے۔ تمدن ایک مخصوص ذہنی میلان یا اندازِ فکر کا نام ہے جو ایک خاص قسم کی سیرت و کردار کی تشکیل کرتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ کسی قوم کا مخصوص اخلاقی اور عقلی مزاج ہے جس کے مطابق اس کے افراد پر حالات و واقعات کا ایک خاص ردعمل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی قوموں کے

محسوس ظاہری اختلاف کے باوجود ہم انہیں ایک ہی تمدّن کے حامل کی حیثیت سے جانتے ہیں کیونکہ جن عقلی اور اخلاقی عناصر سے اُن کی سرشت کا خمیر اٹھایا گیا ہے وہ سب میں یکساں اور مشترک ہیں۔

پھر اسی تمدّن کے سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جس طرح روشنی کے رنگارنگ فانوسوں سے جو فضا منوّر ہوتی ہے اس کا تاثر ایک ہوتا ہے، بالکل اسی طرح تمدّن کے مختلف مظاہر سے جو ماحول بنتا ہے اُس میں پُوری ہم آہنگی اور یک رنگی پائی جاتی ہے۔ بلکہ تمدّن کا تو کام ہی یہی ہے کہ وہ ایک ایسی معاشرتی فضا ہموار کرتا ہے جس میں لوگ سیاسی قوت وطاقت اور آئینی پابندیوں کے بغیر اپنے آپ کو سیرت وکردار کے ایک خاص سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور اس طرح اُن کے اندر افکار ونظریات اور احساسات و جذبات کی وحدت نمودار ہوتی ہے

یہ وحدت کسی فرد یا قوم کا سب سے اہم سرمایہ ہے ۔اسی کے ذریعہ ایک قوم یا ملت دوسری اقوام یا ملل سے اپنے آپ کو ممیز اور ممتاز کرتی ہے۔ خاص طور سے اُس قوم کے لیے تو اس کا وجود اور بھی ضروری ہے جس کی اساس نہ تو جغرافیائی حدود ہوں اور نہ ہی رنگ ونسل اور زبان کے اختلافات ۔ایسی قوم اگر اپنا ملی وجود برقرار رکھنے کا عزم رکھتی ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ معاشرتی نقطۂ نظر سے دوسری اقوام سے الگ ہو۔ خیالات و نظریات کا اختلاف بلاشبہ قوموں کی ذہنی نشو ونما کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن ایک عام آدمی اس اختلاف کو اس کے پورے مضمرات کے ساتھ اُسی وقت سمجھ سکتا ہے جب یہ افکار ونظریات تمدّن کے رنگارنگ مظاہر میں لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہوں۔

یہی نہیں بلکہ اسی معاشرتی وحدت کی بدولت قوم کے مختلف افراد اور طبقات کے درمیان کامل اتحاد جنم لیتا ہے۔ دنیا کا کوئی فرد ایسا نہیں جو اپنے احساسات اور افکار کے نقطۂ نظر سے دوسرے افراد سے پوری طرح متفق اور متحد ہو۔ بُعد مکانی اور انفرادی اغراض کے تصادم سے افراد میں بالکل فطری طور پر علیحدگی کا احساس موجود رہتا ہے۔ علیحدگی کے اس احساس کو اگر ایک طرف افکار و نظریات کی ہم آہنگی اتحاد و اتفاق میں بدلتی ہے تو دوسری طرف معاشرت کا جذباتی تعلق بھی سماج کے مائل بہ انتشار اجزا کو جوڑ کر انہیں بنیان مرصوص بناتا ہے۔ ملت جو ایک نفسیاتی حقیقت ہے اپنا اظہار دو طریقوں سے کرتی ہے۔ ایک تو افراد کی ذہنی کیفیات کے ذریعہ اور دوسرے تمدنی اداروں کے توسط سے، جیسے زبان، ادب، فنونِ لطیفہ وغیرہ۔

یہ ذہنی کیفیات اور تمدنی ادارے نہ صرف افراد کو ایک دوسرے سے جوڑتے ہیں بلکہ ایک فرد کے اندر بھی جذباتی اور نفسیاتی ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ ہم میں سے کون سا ایسا شخص ہے جس کے جذبات اور امیال و عواطف میں کشاکش نہ ہو۔ ان بھری ہوئی قوتوں کو اگر یونہی برسرِ پیکار رہنے دیا جائے تو انسانی خودی کا استحکام نہیں ہو سکتا۔ یہ معاشرتی ماحول کا اعجاز ہے کہ وہ ان ناتراشیدہ عناصر کی تہذیب کر کے ان کے اندر تطابق و توافق پیدا کرتا ہے اور اس طرح انہیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ زندگی میں توسیع و استحکام کا ذریعہ بنیں۔ انسانی عزائم کی تہ ٹٹولیے تو ان کے ڈانڈے ہمیشہ جذبات سے ملے ہوئے نظر آئیں گے جو افراد اور جماعتوں کو تخلیقی مقاصد پر اُبھارتے ہیں۔ بزمِ حیات کی رونق انہیں کے دم قدم سے قائم ہے۔ اگر آپ زندگی کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں عقل سے کہیں زیادہ جذبات اور احساسات کو دخل حاصل ہے۔ زندگی کی ان بیش بہا قوتوں کو صحیح راہ پر لگانے کے لیے جہاں افکار و تصورات ضروری ہیں وہاں معاشرتی ماحول بھی بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے بلکہ ہم تو یہ

کہیں گے کہ اس کی اہمیت معتقدات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے کیونکہ جذبات جس شدت کے ساتھ معاشرتی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں نظریات و افکار سے کبھی نہیں ہوتے۔

معاشرتی ماحول کی اہمیت کو دنیا کی ہر زندہ قوم نے پوری طرح محسوس کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ اپنے تمدنی اور تہذیبی اداروں کی وساطت سے اس ماحول میں ہم آہنگی پیدا کی جائے کیونکہ اس چیز کے ناپید ہو جانے سے نہ صرف افکار و نظریات متزلزل ہوتے ہیں بلکہ جذبات و احساسات کی دنیا بھی زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ آپ کسی زندہ قوم کی ثقافتی سرگرمیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اُس قوم کے بنیادی تصورِ حیات کی ترویج و اشاعت کے لیے پوری طرح وقف ہیں۔

اسلام سے قبل اہلِ عرب جس کلچر کے دلدادہ تھے وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ان کے دن اور ان کی راتیں شراب خوری اور رقص و سرود کی محفلوں میں بسر ہوتیں۔ مرد و زن کے آزادانہ میل جول کا یہ عالم تھا کہ خانۂ کعبہ کے طواف کے لیے جب لوگ آتے تو برہنہ ہو کر آتے۔ عورتوں کے حسن کے کھلے بندوں چرچے کیے جاتے اور ان سے آشنائی پر فخر کا اظہار ہوتا۔ اسلام جب دنیا میں آیا تو اس نے فکر و نگاہ کے زاویے بدلنے کے ساتھ ساتھ ان تہذیبی سرگرمیوں کو بدل کر رکھ دیا جو اس قوم میں عرصۂ دراز سے جاری تھیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شراب پر ان مرمٹنے والوں نے نہ صرف اس دخترِ رز سے کلی اجتناب کیا بلکہ ساغر و مینا بھی توڑ دیے۔ وہ کان جو عود و بربط اور چنگ و رباب کے علاوہ کسی دوسری آواز سے ناآشنا تھے اُن کے لیے اب اگر کوئی آواز خوش آئند معلوم ہوتی تو وہ صرف کلامِ الٰہی کی آواز تھی۔ مذہبیہ اور تقاضاؤں کے ان قدر دانوں کے اندر عفت و عصمت کا اتنا شدید احساس پیدا ہوا کہ سخت سے سخت نازک موقعوں پر بھی اُن کا دامن معصیت سے آلودہ نہ ہونے پاتا تھا۔ معصیت تو خیر ایک بڑی چیز ہے وہ تو اس معاملہ میں اس قدر محتاط تھے کہ معاشرے کے اندر اس بات

کو بھی گوارا نہ کیا جاتا کہ کسی غیر مرد کا طائرِ وسوسہ بھی کسی خاتون کے حریمِ عفت کی طرف پرواز کرے۔

کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ تشویشناک صورتِ حال اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اُس کے افکار و نظریات اور جذبات و احساسات کے اندر انتشار ہو یا دوسرے لفظوں میں جن معتقدات پر وہ ایمان رکھتی ہے اور اُن کی ترویج کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن سمجھتی ہے انہیں عمل کی دنیا میں نظر انداز کر دے۔ نہ صرف نظر انداز کرے بلکہ ایک ایسی روش اختیار کرے جس سے ان نظریات کی نفی ہوتی ہے۔

امتِ مسلمہ ایک عرصہ دراز سے قول و عمل کے اسی تضاد میں گرفتار چلی آ رہی ہے افکار و نظریات کی دنیا میں بار بار تحریک ہوتی ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ اب یہ قافلہ ایک صحیح سمت پر قدم اٹھانے والا ہے۔ لیکن افسوس کہ توقعات کے یہ خواب اور امیدوں کے یہ خیالی خاکے قلب و نگاہ کو پوری طرح نشاط و آسودگی بھی بخشنے نہیں پاتے کہ عمل کی دنیا میں بعض ایسی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں جن سے دل بیٹھ جاتے ہیں اور پوری قوم ایک شدید دھچکا سا محسوس کرتی ہے۔

آپ دُور نہ جایئے، صرف پاکستان کے گذشتہ ۱۲ برس کے واقعات پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جس چیز نے ہماری ترقی کا راستہ روک رکھا ہے وہ اسلام کے معاملے میں قول و عمل کا یہی تضاد ہے۔ ہمارے رہنماؤں کے بیانات اور اعلانات سے جو امیدیں بندھتی ہیں خود انہی کی سرگرمیوں سے ٹوٹ کر رہ جاتی ہیں۔ اسلام کے ساتھ اس ملک اور قوم کا جو گہرا تعلق ہے، خواہ وہ جذباتی ہی سہی ــ اُسے دنیا پوری طرح جانتی ہے لیکن اس دین کے ساتھ عملاً جو سلوک کیا جا رہا ہے اُس کو حسنِ ظن کی آخری سرحد کو چھو لینے کے بعد

بھی سراہا نہیں جا سکتا۔ ان سارے واقعات کی اگر پوری تفصیل بیان کی جائے تو بات طویل ہو جائےگی اس لیے ہم صرف گذشتہ دو ماہ کی ثقافتی کارگزاریوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو آج کل اس اسلامی معاشرے میں جاری ہیں۔

ایک انسان جب ایک طرف صدرِ مملکت اور اربابِ بست و کشاد کے خوش کن اعلانات دیکھتا ہے اور دوسری طرف ان اخلاق سوز سرگرمیوں کا جائزہ لیتا ہے جو اسلام کی عین ضد ہیں تو گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے اور حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ آخر ان کی ترقی سے اس ملت کو کس طرح قوت و طاقت فراہم ہوگی اور اسلامی انقلاب کا خواب کس طرح شرمندۂ تعبیر ہوگا۔

آئیے اب یہ دیکھیے کہ خلوص نیت کے باوجود قوم کو کس ذہنی انتشار میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ ہمارے محترم صدرِ مملکت نے ابھی پچھلے دنوں حلفِ وفاداری اٹھاتے ہوئے جو تقریر ارشاد فرمائی تھی اس کے چند فقرے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

"میرا اوّلین فرض یہ ہے کہ میں اس خدائے عزوجل کا شکریہ ادا کروں جس نے مجھے وطنِ عزیز کی خدمت کرنے کا موقع عطا کیا ہے میں اس کی رحمتوں اور برکتوں کے لیے دعا مانگتا ہوں تاکہ میں اس اعتماد سے جرأت اور دیانتداری کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکوں جس کا مجھ پر اظہار کیا گیا ہے۔ میرا دوسرا فرض یہ ہے کہ میں اُن تمام لوگوں کا دلی شکریہ ادا کروں جنھوں نے مجھ پر اظہارِ اعتماد کیا۔ میں ان کے اعتماد کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ہر وہ کام کروں گا جس کی میرا جسم اور روح اجازت دیتے ہیں۔ ان لوگوں سے جنہوں نے میرے خلاف ووٹ دیا ہے میں یہ کہوں گا کہ آپ نے رائے دہی کے اپنے بنیادی حق کو جرأت سے بلا خوف استعمال کیا ہے اور میں آپ کو بھی مطمئن کرنے کے لیے جو کچھ کر سکا کروں گا۔"

"میں آپ کے اعتماد کے ووٹ کی تعمیل میں بہت جلد آئین کمیشن مقرر کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جو ملک کے اہم اور ممتاز آدمیوں پر مشتمل ہوگا تاکہ وہ جہاں تک

ممکن ہو۔ اپنی سفارشات پیش کرے۔ اصل میں ہمیں ایک ایسے آئین کی ضرورت ہے جو جمہوری ہو اور جسے لوگ آسانی سے سمجھ سکیں اور جس پر عمل کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ جس کو چلانے کے لیے کم خرچ کرنا پڑے۔ ہمیں ایک ایسے آئین کی ضرورت ہے جو ہمیں ایک اچھے مسلمان کی طرح زندگی بسر کرنے کے قابل بنا سکے۔ یہ کام کہ حکومت کے کاروبار میں اسلامی روح منعکس ہو ایک مشکل اور نازک خواہش کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن میں حکومت کے کاروبار میں اسلامی روح پیدا کرنے کی پوری ایمانداری اور سرگرمی سے کوشش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے خیال میں ایمان چند عقائد کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم زندگی کی روح کے سائنسی ادراک میں بھی پایا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ آؤ ہم سب کوشش کریں اور دیکھیں کہ ہم انسان ہونے کی حیثیت سے کہاں تک خدا کے اس عظیم مذہب پر عمل کر سکتے ہیں۔ (کوہستان - ۱۶ر فروری ۱۹۶۰ء)

اس مقدس اعلان کے پورے آٹھ دن بعد اخبارات میں یہ خبر آتی ہے:

"میوزک کانفرنس کے سات اجلاس باغ جناح کے اوپن ائیر تھیٹر میں ہوئے جو ہفتہ سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ کانفرنس کے پروگرام میں ہلکی پھلکی اور کلاسیکی دونوں نوع کی موسیقی شامل تھی اور ان پروگراموں میں پاکستان، ہندوستان اور ایران کے کہنہ مشق اساتذہ کے علاوہ نوعمر جواہر قابل نے بھی حصہ لیا۔ پیر کی شب کو ہلکی پھلکی موسیقی کا پروگرام تھا۔

بدھ کی رات کو صدر مملکت محمد ایوب خاں نے بالکل غیر متوقع طور پر محفل موسیقی کو رونق بخشی۔ یہ کانفرنس کی آخری نشست تھی اور اس لحاظ سے بہت اہم تھی کہ اس میں چیدہ چیدہ فنکاروں کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ صدر نے بڑے انہماک سے روشن آرا بیگم اور ستار نواز شریف پونچھ والے کے نغمات سنے۔ ملک کے مصروف ترین رہنما کی آمد جس طرح غیر متوقع تھی اسی طرح وہ توقع سے زیادہ دیر محفل میں بیٹھے اور اس سے فنکاروں کے

حوصلے بڑھے۔ اس نشست میں استاد سردار خاں، استاد قادر بخش کھاوجی، مختار بیگم اور دوسرے فنکاروں نے بھی بلند معیار کی چیزیں پیش کیں۔ یہ محفل درحقیقت اس کانفرنس کی روح تھی اور ایک طرح سے ملک کی مایۂ ناز مغنّیہ روشن آرا بیگم کی محفل تھی۔۔۔۔ سامعین نے بڑے احترام اور انہماک سے روشن آرا کو سنا اور جب انہوں نے راگ ختم کر لیا تو مزید کی فرمائش کی۔۔۔۔ جب مرغانِ سحر کی اذانیں فضا میں گونجنے لگیں تو روشن آرا نے تنبورا ہاتھ سے رکھ دیا اور یہ یادگار محفل برخاست ہوئی۔" (امروز ۔ ۲۵ فروری ۱۹۶۰ء)

اس موقع پر جن فنکاروں نے اپنے فن کے کمالات دکھائے اُن کی باقاعدہ پذیرائی کی گئی اور مملکت کے سب سے بڑے سربراہ نے جو اسے ایک اسلامی مملکت بنانے کا عزم رکھتے ہیں، ان فنکاروں کی خدماتِ جلیلہ کا پوری طرح اعتراف کرتے ہوئے یوم پاکستان کے موقع پر انہیں مختلف انعامات سے نوازا۔ روشن آرا بیگم، عباس الدین احمد، مبارک علی اور فتح علی، ان میں سے ہر ایک کو پریذیڈنٹ میڈل کے علاوہ پانچ ہزار کی خطیر رقم بھی عطا کی گئی (پاکستان ٹائمز، ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء)

یہی نہیں بلکہ مرکزی حکومت نے کھیلوں اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے جو کمیٹی مقرر کی تھی اُس نے حال ہی میں مرکزی کابینہ کے سامنے مندرجۂ ذیل تجاویز رکھی ہیں:

(۱) ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے دو خود مختار ادارے قائم کیے جائیں جن میں ایک ادارہ رقص و موسیقی اور دوسرا فنونِ لطیفہ کو فروغ دینے کا کام کرے گا۔ یہی ادارے آرٹ کونسلوں، رقص، ڈراموں اور فلموں کے اداروں کی نگرانی کریں گے۔

ان اداروں کے کام کو صحیح طریق پر انجام دینے کے لئے لائبریریاں بھی چاہییں (یعنی وہ لٹریچر جو ناچ، گانے، فلم سازی وغیرہ پر شائع ہو چکا ہے، اسے جمع کیا جائے)۔

(۲) ان فنون کی باقاعدہ تربیت دینے کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ کا انتظام کیا جائے۔

(۴) صدرِ مملکت سے اپیل کی جائے کہ ان ثقافتی اداروں کے قیام کے لیے جو چندہ دیا جائے اسے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

(۵) کھیلوں اور ثقافتی محفلوں میں شرکت کے لیے کھلاڑیوں اور فن کاروں کو ہوائی جہاز اور ریل گاڑی کے سفر میں رعایت دی جائے۔

(۶) کھیلوں اور ثقافتی محفلوں کو ٹیکس سے بری کیا جائے۔

(۷) موسیقی اور کھیل کے سامان کی درآمد سے ڈیوٹی ختم کی جائے۔

(۸) کھلاڑیوں اور فن کاروں کے لیے انشورنس سکیم تیار کی جائے۔

یہ سفارشات اُس ملک کی کابینہ سے کی جارہی ہیں جسے جان و مال اور عزت و آبرو کی بے شمار قربانیاں دے کر صرف اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اُس وقت یہ معلوم ہو جاتا کہ آنے والے پاکستان میں حکومت کو اقامتِ صلوٰۃ و ایتاءِ زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بجائے رقص و سرود، فلموں اور ڈراموں، اور "فنونِ لطیفہ" کے فروغ سے دلچسپی ہوگی اور اس میں تبلیغِ دین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والوں کے بجائے "ثقافتی محفلیں" آراستہ کرنے والے گویّوں کو ریل اور ہوائی جہاز کے سفر کی سہولتیں دی جائیں گی اور خیر و صلاح کے کاموں کے بجائے اِن ثقافتی اداروں کو دیے جانے والے چندے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے تو وہ کبھی جان و مال کے اس زیاں پر آمادہ نہ ہوتے۔ انہوں نے اگر آگ و خون کے سمندر سے گزرنا گوارا کیا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس خطّہ پاک کو اسلام کی تجربہ گاہ دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ ناچ رنگ اور فسق و فجور کی ثقافت اور یہ مصوری و مجسمہ تراشی کسی پاکستان کے قیام کی محتاج نہ تھی۔ یہ سارے کام تو متحدہ ہندوستان میں بھی بڑی آسانی کے ساتھ ہو سکتے تھے بلکہ شاید اس سے بہتر ہوتے، کیونکہ ہندو تہذیب اور مذہب، دونوں ان کو پروان چڑھانے میں مددگار بن سکتے تھے۔

اس معاملہ میں لطف کی بات یہ ہے کہ رقص و موسیقی کسان اداروں کے قیام کو بھی اسلام ہی کی ایک بہت بڑی خدمت بتایا جا رہا ہے۔ چنانچہ انہی مس روشن آرا صاحبہ نے، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، علمائے دین اور دین دار لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا ہے کہ "آپ لوگ جو رقص و موسیقی کو حرام قرار دے کر ان کے خلاف لوگوں میں نفرت کا جذبہ ابھار رہے ہیں آپ کا یہ موقف غلط ہے اور صحیح مسلک یہ ہے کہ چونکہ رقص و موسیقی سے روحانیت کھل کر حاصل ہوتی ہے اس لیے اسلام رقص و موسیقی کا مخالف نہیں"

مس روشن آرا کے اس نظریہ کی تائید مغربی پاکستان کے گورنر جناب اختر حسین صاحب یوں فرماتے ہیں:

"مسلمانوں نے اپنی پوری تاریخ میں ثقافت اور اس کے مختلف مظاہر، جس میں فنون لطیفہ، تعمیرات، مصوری اور موسیقی شامل ہیں، کی پوری پوری سرپرستی کی ہے۔ حکومت پاکستان کو مسلمانوں کے اس تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کی قدر و قیمت کا اچھی طرح احساس ہے اور اس نے ان سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کے لیے مختلف اداروں کو ۱۰ لاکھ روپے کی مالی امداد دی ہے"

(پاکستان ٹائمز - ۲۰ فروری ۱۹۶۰ء)

مشرقی پاکستان کے گورنر جناب ذاکر حسین صاحب نے بھی اسی قسم کے احساسات کا اظہار فرمایا ہے:

"پاک و ہند کے مسلمان موسیقی میں عظیم الشان روایات کے حامل ہیں۔ خصوصاً مغل بادشاہوں نے کلاسیکی موسیقی کی سرپرستی کر کے اس کی ترقی اور ترویج و اشاعت میں جو عظیم خدمت سرانجام دی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ بعد میں آنے والی نسلیں سیاسی غلامی کی وجہ سے اس بیش قیمت ورثہ کی پوری طرح حفاظت اور پاسبانی نہ کر سکیں۔ یہ بات بڑی خوش آئند معلوم ہوتی ہے کہ موسیقی کا ذوق لوگوں میں پھر سے بیدار ہو رہا ہے" (پاکستان ٹائمز ۲۰ فروری ۱۹۶۰ء)

بے شک، ان فنونِ عالیہ کا بڑا دَور دورہ محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ جیسے بندگانِ ملت کے دَور میں رہا ہے۔ لیکن اس وقت ان مشاغل میں مستغرق رہنے کے باوجود کوئی ان چیزوں کو "عین اسلامی تہذیب" قرار دینے والا نہ تھا، اور نہ کسی رقاصہ ومغنّیہ کی یہ ہمت تھی کہ علماء اور اہلِ دین کو خطاب کر کے یہ کہہ سکتی کہ میرے اس کام کو حرام قرار دینے میں تم غلطی پر ہو۔ یہ تازہ ترقی اس پاکستان میں ہمیں میسر آئی ہے جس میں ہم کو "ایک اچھے مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے" کا ارادہ ظاہر فرمایا جا رہا ہے۔

ان بیانات میں چونکہ اسلام اور اسلامی روایات کا بار بار ذکر کیا گیا ہے اور موسیقی کو دینی خدمت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک نظر اسلامی تعلیمات پر بھی ڈال لیں۔ قرآن حکیم میں سورۂ لقمان میں نہایت واضح الفاظ میں فرمایا گیا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (رکوع ۱)

اور لوگوں میں سے کوئی ہے جو "لہو الحدیث" کا خریدار بنتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے بے جانے بوجھے لوگوں کو اللہ کے راستے سے بھٹکائے اور اس کا مذاق بنائے۔ ایسے لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

حضرت حسن بصری "لہو الحدیث" کی تشریح میں فرماتے ہیں:

كل ما شغلك عن عبادة الله وذكره من السمر والاضاحيك والخرافات والغناء ونحوها۔ (روح المعانی)

"لہو الحدیث" میں ہر وہ چیز شامل ہے جو اللہ کی عبادت اور اس کی یاد سے غافل کرنے والی ہو مثلاً قصہ گوئی، ہنسی مذاق کی باتیں، واہیات مشغلے اور گانا بجانا وغیرہ۔

روایات میں ہے کہ نضر بن حارث نے ایک مغنیہ صرف اس غرض کے لیے خرید رکھی تھی کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو دینِ حق سے برگشتہ کرے۔ اُسے جب کسی شخص کے متعلق یہ علم ہوتا کہ اس کا دل

اسلام کی طرف مائل ہو رہا ہے تو فوراً اس عورت کو اس کی خدمت میں بھیج دیتا تاکہ وہ اسے اپنے دلکش نغموں سے مسحور کرے اور پھر اس شخص سے مخاطب ہو کر کہتا: دیکھ یہ اس سے بہتر ہے جس طرف کو محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں بلا رہے ہیں۔ نماز پڑھنا، روزہ رکھنا تو زندگی پر شاق گذرتے ہیں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزامیر و ملاہی کو یکسر حرام قرار دیا ہے اور امام بخاری نے اسی چیز کو ایک باب کا عنوان قرار دیا ہے۔

طبرانی وغیرہ نے ابن عباس سے یہ حدیث مرفوع روایت کی ہے کہ شیطان نے کہا، اے رب! میرے لیے ایک گھر خاص کر دے۔ خدا نے فرمایا: تیرا گھر حمام ہے۔ اس نے کہا میرے لیے ایک قرآن بنا دے (قرآن کے لفظی معنی ہیں، ہر وہ کلام جو بار بار پڑھا جائے) فرمایا تیرا قرآن شعر ہے۔ اس نے کہا، میرے لیے ایک مؤذن مقرر کر دے۔ فرمایا، تیرا مؤذن مزمار (باجا) ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ۔ (۱۷: ۶۴)	ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے، بہکانے کی کوشش کرے، اور اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں کو ان پر چڑھالا۔

شیطان کی آواز کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ وہ گانا ہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

اِنّمَا نُھِیتُ عن صوتین احمقین فاجرین صوت لھو ولعب و مزامیر الشیطٰن وصوت لطم خدود و شق جیوب و دعاء بدعوی الجاھلیہ	مجھے دو احمق اور فاجر آوازوں سے منع کیا گیا ہے ایک لہو ولعب اور مزامیر شیطان کی آواز۔ دوسرے منہ پیٹنے، گریبان پھاڑنے اور جاہلیت کے نعروں کی آواز۔

مزامیر کی حرمت پر اہلِ علم کا پورا پورا اتفاق ہے۔ ابن الصلاح نے تو دف اور سارنگی پر گانے کی حرمت پر بھی علما کا اجماع نقل کیا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جلیل القدر رفقاءِ کار کا احساس اس گانے بجانے کے معاملہ میں جس قدر نازک تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل

واقعات سے کیا جا سکتا:

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے طبلہ کی آواز سنی تو کان بند کر لیے اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

(سنن ابن ماجہ کتاب النکاح، باب الغناء والدف)

اسلام کا یہی بطلِ جلیل ایک دفعہ اونٹ پر جا رہا تھا۔ چرواہے کی بانسری کی آواز کان میں آئی تو فوراً کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور پہلا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ وہ اس اثنا میں بار بار اپنے غلام نافع سے پوچھتے تھے کہ کیا ابھی آواز آ رہی ہے؟ جب انہوں نے کہا "نہیں" تو کانوں سے انگلیاں نکالیں اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کے مواقع پر یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے (طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ مجھے مزامیر اور معازف مٹانے کے لیے بھیجا گیا ہے[1]۔

حضور سرورِ کائنات اور خلفائے راشدین کے دَور کے بعد بھی اتقیا اور صلحا نے اس گانے بجانے کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

امام شافعیؒ نے فرمایا: میں بغداد کو ایک ایسی چیز کی وجہ سے چھوڑ آیا ہوں جسے زندیقوں نے ایجاد کیا ہے یعنی گانا بجانا۔ اس کے ذریعے انہوں نے لوگوں سے قرآن چھڑا دیا ہے۔

یزید بن ہارون کا قول ہے: یہ گانا بجانا فاسقوں کا عمل ہے اسلام میں کبھی نہ تھا۔

امام احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا اَکْرَھُہٗ وَ ھُوَ مُحْدَثٌ، یعنی میں اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور یہ بدعت ہے پھر پوچھا

---

[1] مزامیر وہ آلات طرب ہیں جو منہ سے بجائے جائیں اور معازف وہ آلات ہیں جو ہاتھ یا مضراب سے بجائے جائیں۔

گیا کہ کیا آپ کو ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا گوارا ہے ؟ فرمایا نہیں۔
یہی حال دوسرے ائمۂ دین کا تھا سب نے اسے ممنوع، مکروہ اور ناپسندیدہ بتایا۔ اکابر صالحین نے بھی اسی روش کو اختیار کیا۔ انہوں نے کبھی ایسے سماع میں شرکت نہیں کی چنانچہ ابراہیم بن ادہمؒ، فضیل بن عیاضؒ، معروف کرخیؒ، ابو سلیمان دارانیؒ، احمد ابن ابی حواریؒ، سری سقطیؒ نے کبھی ایسی شیطانی مجالس میں جانا پسند نہ فرمایا[۱]۔ اسی طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ عدیؒ، شیخ البیانؒ، ایسے جلیل القدر مشائخ بھی اس لعنت سے ہمیشہ دور ہی رہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی اور اس طرز کے دوسرے بزرگوں نے تو اس کی بالتصریح مخالفت کی ہے۔
بزرگانِ چشت نے اگر گانا سنا ہے تو وہ عورتوں اور لڑکوں کا نہیں بلکہ سن رسیدہ صالح لوگوں کا گانا مزامیر کے بغیر ہوتا تھا، اس میں صرف صلحاء شریک ہوتے تھے، اور صرف توحید و معرفت کے پاکیزہ اشعار گاتے جاتے تھے۔ یہ آخری حدِ جواز ہے جسے نقطۂ آغاز بنا کر روشن آرا بیگم اور مختار بیگم کے گانوں تک نوبت پہنچا دینا اور پھر دعویٰ کرنا کہ اسلام اس موسیقی کو حلال کرتا ہے، خدا کے دین پر سخت ظلم ہے۔

امت کے ائمہ اور صلحاء نے اس قسم کی کلچرل سرگرمیوں کے خلاف صرف فتویٰ دے دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُن اسباب و علل پر بھی بحث کی ہے جن کی وجہ سے یہ گانے بجانے کا مشغلہ اسلام میں حرام ٹھیرایا گیا ہے۔ امام شافعیؒ کا قول اوپر گزر چکا ہے کہ اس ثقافتی شغل سے لوگوں کے اندر قرآن سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ "گانا زنا کا افسون ہے"۔ اور یہ بات بالکل صحیح و درست ہے۔ مشاہدہ اس کی تائید کرتا ہے۔ خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے لوگ جو چاہیں کہتے رہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس سے انسانی دل و دماغ پر نہایت برے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ جس طرح شراب

---

[۱] السماع والرقص، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

ایک انسان کو بدمست کر دیتی ہے بالکل اسی طرح گانا سن کر انسان پر حالتِ سکر طاری ہو جاتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان اگر کوئی فرق ہے تو یہی کہ شراب منہ کے راستے سے پیٹ کے اندر داخل کی جاتی ہے اور گانا بجانا کانوں کے ذریعہ جسم کے اندر سرایت کرتا ہے۔ بہرحال اس امر واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم ترین زمانہ سے موسیقی، رقص، شراب اور زنا کے درمیان گہرا تعلق رہا ہے۔

اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے ابوالفرج بن جوزی نے ارشاد فرمایا:

"گانے میں دو مضرتیں ہیں: ایک طرف تو وہ قلب کو عظمتِ الٰہی میں تفکر سے روکتا اور اُس کی خدمت سے باز رکھتا ہے۔ دوسری طرف اُسے مادی لذتوں کی تحصیل کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ تمام مادی لذتیں حاصل کر لی جائیں اور معلوم ہے کہ مادی لذتوں میں سب سے زیادہ قوی مرد اور عورت کے اختلاط کی لذت ہے۔ مگر یہ لذت اُس وقت مکمل ہوتی ہے جب اس میں تجدد ہوتا رہے اور ظاہر ہے کہ حلال طریقہ پر یہ تجدد ممکن نہیں۔ لہٰذا گانا زنا کا محرک ہے۔ ان دونوں میں گہری مناسبت ہے۔ گانا روح کی لذت ہے اور زنا نفس کی سب سے بڑی لذت ہے[۱]۔"

دورِ جدید کے بہت بڑے مبصر علامہ اقبالؒ نے بھی آرٹ پر بحث کرتے ہوئے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ گہرے غور و فکر کے محتاج ہیں:

"حیات، تمام انسانی اعمال کا منتہائے مقصود ہے۔ انسانی اعمال کا مقصد یہ ہے کہ اس کی زندگی شاندار، مؤثر اور بہتر ہو جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جملہ انسانی آرٹ کو اس مقصدِ عظمیٰ کے ماتحت رکھا جائے اور جو شے زندگی کو جس قدر فراوانی عطا کرے اُسی قدر اعلیٰ اور اشرف خیال کی جائے۔ بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر خفتہ قوتِ ارادی کو بیدار کر دے تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ

(باقی آخر میں)

۱۔ السماع والرقص۔ امام ابن تیمیہ